اقبالؒ کی تمثیل نگاری۔ جُزوی مطالعہ

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن میو

Dr. Ata-Ur-Rehman Meo,

Associate Professor, Department of Urdu,
Govt. M.A.O College, Lahore.

Abstract:

Allegory is basically a Dramatic Term which, means to give an example,to similarize and to do accordingly.The use of Allegory in Fine Arts has a universal value except Drama.We can say that this technical action is because of Allegory in more aspects.Because of this, a poet discovers the common relations of Universe as well as create new totallities by organizing them initially.Although anciant Greek theory of Art based at this rule yet in modern poetry,it became a movement.It is a type of poetic imagination which finds and prolongs the similarites between things.

کلیدی الفاظ:

تمثیل۔مصباح اللغات۔موجِ تہ نشیں۔بالارادہ ترسیل۔دیومالائی۔مماثل تصور۔علامتی حکایت۔موجوں کی تجسیم۔غیر مرئی۔انسانی پیکر۔سب رس۔قصۂ حسن ودل۔گلزارِسُرُور۔نیرنگِ خیال۔دستورِعشاق۔مردِمومن۔تبع تابعین۔شریعتِ اسلامیہ۔خودی۔بےخودی۔ذوقِ جمال۔سوزِ دروں۔ جمالِ دوستی۔کامل الفن۔مغربی تمثیل۔مشرقی تغزل۔غزل سرائی۔حشرات الارض۔غم خانۂ جہاں۔نخلِ تمنّا۔عاشقِ حُسنِ قدیم۔مرغِ نغمہ پیرا۔تجلّی زار۔

اردو زبان میں ''تمثیل'' کے مترادف کے لیے انگریزی لفظ ''Allegory'' لایا جاتا ہے۔ منظر اعظمی ''مصباح اللغات'' کے حوالے سے ''تمثیل'' کا معنیٰ ومفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''اب تمثیل کو لیجیے۔تمثیل دراصل عربی کا لفظ ہے۔تمثیل،سامنے ہونا،شکل دکھانا اور مثال دینا ہے۔ یعنی ایک چیز متشکل ہو کر سامنے آجائے۔عربی میں یہ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔چنانچہ تمثیل الحدیث بالحدیث معنی بیان

کرنا۔ ہذا بیت مثل یمثل بہ یعنی یہ شعر مثال ہے جس کی مثال دی جاتی ہے۔ تمثیل مثالاً نمونہ بنانا، الشئ بالشئ مشابہت دینا اور التمثال تصویر اور مجسمہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔''(۱)

''درسی اردو لغت'' میں تمثیل کے معانی یوں درج ہیں:

''تمثیل: (تَم +ثی +ل)[اسم ۔مؤنث۔واحد] ا۔مثال دینا۔مشابہت۔مطابقت۔۲۔ڈراما۔جس میں کسی کہانی یا واقعہ کو عمل کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔نقل۔جمع تماثیل۔''(۲)

تمثیل نگاری سے متعلق ڈاکٹر گیان چند کا خیال ہے:

''تمثیل کے کردار دراصل کسی دوسرے کردار کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ان سے وہ مراد نہیں ہے جو ظاہراً نظر آتا ہے۔بل کہ ان کے نیچے موجِ تہ نشیں کی طرح کچھ اور معنی چھپے ہوتے ہیں۔''(۳)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں تمثیل نگاری کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''تمثیل نگاری علامات اور اشارات کے ذریعہ ظاہراً مفہوم کے علاوہ ایک مزید اور گہرے معنی کی طرف بالارادہ ترسیل کا نام ہے۔اس طرح تمثیل نگاری کو اپنے مختلف تلازمات کے ساتھ ایک وسیع استعارہ کہا جاسکتا ہے۔تمثیل دیومالائی اور اخلاقی کہانیوں سے کہیں زیادہ وسیع اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ جہاں مشابہت معقول ہو، وہاں تمثیل تخلیقی ہوتی ہے۔تمثیل کا خصوصی اطلاق ادب پر ہوتا ہے، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔''(۴)

انسائیکلوپیڈیا آف پوئٹری اینڈ پوئٹکس میں تمثیل کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''ادب کی ایک صفت کے لیے یہ اصطلاح استعمال ہوتی ہے جو نتیجہ کے طور پر تنقید کے طریقے کو جنم دیتی ہے۔تمثیل واقعہ لکھنے کا ایک اسلوب ہے، کیوں کہ تمثیل کے لیے کوئی بیانیہ بنیاد ضرور ہونی چاہیے۔جب کسی قصے کے واقعات ظاہر طور پر یا لگاتار کسی دوسرے مماثل تصور یا ڈھانچہ کی طرف مسلسل نمایاں طور پر اشارہ کریں تو ہم اسے تمثیل کہتے ہیں، چاہے وہ تاریخی واقعات ہوں، اخلاقی ہوں یا فلسفیانہ ہوں یا مظہرِ قدرت کی صورت میں ہوں۔فرضی کہانیاں اور فرضی قصے ایسی قسمیں ہیں جو تمثیل سے نزدیکی اشتراک رکھتی ہیں اور اس کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہیں۔''(۵)

''دی کولمبیا انسائیکلوپیڈیا'' میں تمثیل مفہوم یوں ملتا ہے:

''ادب میں تمثیل نگاری کسی علامتی حکایت کو کہتے ہیں جو اس گہری معنویت کے پردے کا کام دیتی ہے جو ظاہری معنی کی تہ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ کسی تمثیل کے کردار عموماً کای انفرادی شخصیت کے حامل نہیں ہوتے، بل کہ اخلاقی اوصاف اور دوسرے موجودات کی تجسیم ہوتے ہیں۔ تمثیل نگاری کا پیرا ایبل فیبل اور استعارے سے بہت قریبی تعلق ہوتا ہے، لیکن یہ پیچیدگی اور طوالت میں بڑی حد تک ان سے مختلف ہوتی ہے۔''(۲)

تمثیل میں صرف غیر مرئی اشیا اور کیفیات کو مرئی یا مجسّم صورت میں پیش نہیں کیا جاتا، بل کہ مرئی اشیا جیسے جانوروں وغیرہ کو انسانی پیکروں میں ڈھالنے کی سعی بھی نظر آتی ہے۔ اس میں مسلسل استعارات اور تشبیہات سے کام لیا جاتا ہے اور اصل موضوع پر براہِ راست بات نہیں کی جاتی۔

ڈراما اور تمثیل میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ بعض حضرات کا یہ کہنا درست نہیں مانا جا سکتا کہ تمثیل اردو زبان میں انگریزی زبان کی وساطت سے آئی کیوں کہ اردو میں تمثیل کی روایت بہت پرانی ہے۔ ملّا وجہی کی ''سب رس'' اردو کی پہلی تمثیل ہے جسے ۱۰۴۵ھ میں تحریر کیا گیا۔ منشی غلام شاہ بھیک نے محمد یحییٰ ابنِ سبیک فتاحی کے ''قصۂ حسن ودل'' کا ترجمہ ۱۸۰۱ء میں کیا تھا۔ ۱۲۷۵ھ اور ۱۲۷۹ھ کے دوران رجب علی بیگ سُرور نے ''گلزارِ سُرور'' کے نام سے ایک تمثیل تحریر کی۔ اگرچہ اردو میں تمثیل کا آغاز انگریزی زبان کا مرہونِ منّت نہیں لیکن اردو پر انگریزی تمثیل نگاری کا اثر ضرور ہوا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے سٹیل اور جانسن کی تماثیل کو بنیاد بنا کر ''نیرنگِ خیال'' تحریر کی۔ سر سید احمد خاں کے بعض مضامین، سید احمد دہلوی کی ''کنز الفوائد''، سید غلام حیدر خاں کی ''فسانۂ معقول''، مولوی سید نظام الدین کی ''عقل وشعور'' اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناول انگریزی تماثیل کا پرتَو ہیں، اگرچہ یہ تصانیف تمثیل کی تعریف پر پورا نہیں اترتیں۔ بعض شواہد کی بنا پر ''سب رس'' کا ماخذ محمد یحییٰ ابنِ سبیک فتاحی کی تصنیف ''دستورِ عشاق'' اور اس کی نثری تلخیص ''قصۂ حسن ودل'' قرار پاتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فتاحی کی ''دستورِ عشاق'' کا ماخذ ممکنہ طور پر کرشن مشر کا قصہ ''پربودھ چندرودے'' ہے۔ اردو زبان میں نثری اور منظوم تماثیل بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ منظر اعظمی صاحب کو ان کے تماثیل ہونے میں شک وشبہ ہے۔ اس شک وشبہ کا اظہار اور اس کی وجوہات پر انھوں نے اپنی تالیف ''اردو میں تمثیل نگاری'' میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی سے ۱۹۹۲ء کو دوسری بار زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ تخلیق کی ابتدا کے بارے میں ارشادِ ربّانی ہے:

اَوَلَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِیءُ اللّٰہُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہ ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ☆قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَالْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنْشِیءُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ ط اِنَّ اللّٰہَ عَلیٰ کُلِّ شَیءٍ قَدِیْرٌ☆

ترجمہ: کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ مخلوق کی ابتدا کس طرح اللہ نے کی پھر اللہ اس کا اعادہ کرے گا، یہ تو اللہ پر بہت ہی آسان ہے۔ کہہ دیجیے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو تو سہی کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ابتداً پیدائش کی پھر اللہ ہی دوسری پیدائش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔(۷)

انسانی تخلیق کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ☆خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ☆يَّخْرُجُ مِنْ م بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ☆اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ☆

ترجمہ: انسان کو دیکھنا چاہیے کی وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ بے شک وہ اسے پھیر لانے پر یقیناً قدرت رکھنے والا ہے۔(۸)

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ☆خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ☆

ترجمہ: اپنے رب کا نام کے کر پڑھ جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔(۹)

جن لوگوں نے اپنے خالق کے سوا کسی اور کو اس دنیا میں اپنا کارساز بنا رکھا ہے، ان کی مثال اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کی ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ م لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ☆

ترجمہ: جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کارساز مقرر کر رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک گھر بنا لیتی ہے حالاں کہ تمام گھروں سے بودا گھر مکڑی کا گھر ہی ہے۔ کاش کہ وہ جان لیتے۔(۱۰)

سرِ دست ہمارا موضوع ''حشرات الارض'' پر مبنی ڈاکٹر علاّمہ محمد اقبالؒ کی تماثیل ہیں۔ اقبالؒ کے فلسفۂ حیات کو سمجھنے کے لیے ان کے ''تصورِ مردِ مومن'' کو سمجھ لینا کافی ہے۔ اسے جانے بغیر اقبالؒ کے کلام کی تفہیم ممکن ہی نہیں۔ اقبالؒ کا ''مردِ مومن'' بہ یک وقت ''خودی'' اور ''بے خودی'' کا پیکر دکھائی دیتا ہے۔ اس ''مردِ مومن کی ذیل میں سرِ فہرست نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی نظر آتی ہے۔ آپؐ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، تابعین، تبع تابعین اور صالحین کے اسمائے گرامی اسی ذیل میں آتے ہیں۔

اقبالؒ کا ''مردِ مومن''، ''خودی'' کے مراحل طے کرتا ہوا ''بے خودی'' کی منزل تک

پہنچتا ہے۔ ''خودی'' کیا ہے؟ ایک فلسفۂ حیات ہے جس کے زیرِ اثر ایک مردِ مومن اپنی ذات کا ادراک کرتا ہے۔ ایسا ہونا تبھی ممکن ہے جب کہ وہ شریعتِ اسلامیہ (قرآن وسنت) کو سمجھتے ہوئے اپنے خالق کو پہچان لے اور پھر اپنے رب کا ہو کر اس کے تمام احکامات کی تعمیل کرے۔

''بے خودی'' کو اگر اقبالؒ کے ''نظریۂ خودی'' کا تتمّہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ جب ''مردِ مومن'' اپنی خودی کو پہچان لیتا ہے تو اگلا مرحلہ اس کی ذات کی نفی کا مرحلہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنی ذات کو پہچان لیتا ہے اور اُس پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ تو ایک حقیر اور بے مایہ سی چیز ہے، لہٰذا وہ دونوں جہان کی کامیابی و کامرانی اور سُرخ روئی کے لیے اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے خود کو احکامِ الٰہی اور فرامینِ محمد مصطفےٰ ﷺ کے کاملاً تابع کر دیتا ہے۔ اقبالؒ کے کلام سے اس بات کی تصدیق کرتے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

خودی کا سِرِّ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
خودی ہے تیغ، فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ(۱۱)

اقبالؒ ''خودی'' کو علم اور عشق سے محکم دیکھنا چاہتا ہے، ذرا دیکھیے:

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل(۱۲)

اسی لیے اقبال ''مردِ مومن'' کو اپنی استواری کرنے کی نصیحت کر رہا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے(۱۳)

اور یہ تبھی ممکن ہے کہ جب ایک مسلمان حضرت محمد ﷺ کا مکمل طور پر وفادار بن جائے۔ ''جوابِ شکوہ'' میں اقبالؒ اللہ تعالیٰ کی زبانی یوں کہہ رہا ہے:

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں(۱۴)

ذوقِ جمال حسنِ طبیعت اور سوزِ دروں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں کیفیات فنِ شعر گوئی میں لفظ و معنی کی صحیح، موزوں اور مؤثر ترکیب سازی کرتی ہیں۔ اقبالؒ کی شاعری بھی جمال دوستی اور سوز دروں کا بیّن ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنے ''مردِ مومن'' کی تکمیل کے لیے مختلف النوع حربے استعمال کیے ہیں۔ کہیں وہ ''خودی'' کی تعلیم دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو کہیں ''بے خودی کا فلسفہ پیش کرتا ہے۔ کہیں وہ شریعتِ محمدیؐ پر مکمل طور پر عمل کا پرچار کرتا ہے تو کہیں مغربی تہذیب سے بچنے کی تلقین کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے ''مردِ مومن'' کی معمولی سی لغزشوں کے بھیانک نتائج سے بھی آگاہ رہتا ہے۔ اقبالؒ ''مردِ مومن'' کی صفات کا احاطہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

مردِ مسلمان

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن!
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان!
قہاری و غفاری و قدّوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی!
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن!
قاری نظر آتا ہے ، حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیّار ، اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان ، قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں ، وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم
لے اپنے مقدّر کے ستارے کو تو پہچان(۱۵)

ڈاکٹر عبدالمغنی اقبالؒ کی تمثیل نگاری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''ایک ناقدِ فن اور کامل الفن شاعر ہونے کے لحاظ سے یہ اقبالؒ کا حق اور فرض دونوں ہیں کہ ہیئتِ سخن کے سلسلے میں کسی کی نقالی کی بجائے اپنے خاص معیارِ اردو سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس زبان میں اور جن مقاصد کے لیے وہ شاعری کر رہے ہیں وہ مغربی تمثیل کے بجائے مشرقی تغزل کے متقاضی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کے لیے عام طور پر غزل خوانی اور غزل سرائی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جب کہ تمثیل کی خامیوں اور خرابیوں پر وہ تنقید کرتے ہیں۔ حال آں کہ ان کی بے شمار اور بہترین موضوعاتی نظموں میں تمثیل کے اعلیٰ عناصر بڑے ہی نفیس انداز میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کا مقصد ڈراما نگاری نہیں ہے، حقیقت نگاری اور اثر انگیزی ہے، اسی لیے نظموں میں تمثیلوں کا استعمال بالوضاحت علامتوں کے طور پر ہوا ہے، جو خالص شاعری کا

ایک حسین وسیلۂ اظہار ہیں۔ بشرطیکہ وہ مفہوم کی سریت نہیں، صراحت پر مشتمل ہوں۔ جیسا کہ اقبالؒ کی نظموں میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر اقبالؒ کے کلام میں تمثیل کا عنصر ایک وسیع اور عمومی شاعرانہ انداز میں پایا جاتا ہے۔ اس کا خاص مصرف معانی کی استعاراتی تجسیم ہے، جو رنگِ شاعری کا اشاریہ ہے۔ گویا قدیم صنائع و بدائع کا جدید پیرایۂ بیان ہے جو سادہ ترین تشبیہات سے پیچیدہ ترین علامات تک محیط ہے۔ یہ پیکر سازی اور تمثیل نگاری ہے جس کا وافر سرمایہ کلامِ اقبالؒ میں موجود ہے۔ اقبال کا تصور تصویر ساز ہے، ان کے خیالات بالعموم حسین پیکروں میں ہی ظاہر ہوتے ہیں اور یہ قدیم وجدید، مشرق ومغرب اور شوخ ولطیف ہر قسم کے رنگوں اور زاویوں سے بنتے ہیں۔ مظاہرِ فطرت اور صنائع شاعری کا پورا رنگ محلِ اقبالؒ کے تصرف میں ہے۔''(۱۶)

اقبالؒ کی تماثیل دراصل ''مردِ مومن'' کی مذکورہ بالا صفات کی تکمیل کا باعث ہیں۔ اقبالؒ ''مردِ مومن'' کی صفات شاہین اور عقاب میں پاتا ہے نہ کہ زاغ وزغن اور کرگس میں۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجیے:

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ(۱۷)

یہ اسی لیے ہے کہ اقبالؒ شاہین اور کرگس کی فطرت سے بہ خوبی واقف ہے:

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے ، شاہیں کا جہاں اور(۱۸)

اقبالؒ شاہین کی فطرت کو دیکھتے ہوئے اسے قصرِ سلطانی کے گنبد پر ٹھکانہ کرنے کی بجائے پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرنے کا روادار ہے:

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں(۱۹)

اقبالؒ کی تماثیل مختلف النوع ہونے کے ساتھ ساتھ مثبت رویوں کی حامل ہیں۔ ان کے تمثیلی کرداروں میں شاہین، عقاب، زاغ و زغن، کرگس، مکڑا، مکھی، پہاڑ، گلہری، گائے، بکری، خفتگانِ خاک، شمع، پروانہ، عقل، دل، آفتاب، گلِ پژمردہ، لوحِ تربت، ماہِ نَو، موجِ دریا، طفلِ شیرخوار، چاند، جگنو، صبح کا ستارہ، ایک پرندہ اور جگنو، حقیقتِ حُسن، حسن وعشق، کلی، غرّۂ شوال، شبنم، مرغِ سرا، مرغِ ہوا، پھول، کرمک، درخت اور مرغِ صحرا، شپرّک وغیرہ شامل ہیں۔

حشرات الارض بھی اقبالؒ کی شاعری کا موضوع ہیں جن کے ذریعے انھوں نے نہایت عمدہ تماثیل تخلیق کی ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں حشرات الارض جیسے کردار اپنی تماثیل میں لا کر اقبال نے کون کون سے کام لیے ہیں؟

''کلیاتِ اقبالؒ'' میں پہلا مجموعہ ''بانگِ درا'' شامل ہے۔ اس میں پہلی تمثیل ''ایک مکڑا اور مکھی'' ہے جو کہ ماخوذ ہے اور بچوں کے لیے تحریر کی گئی ہے۔ اس تمثیل کا لبِ لباب یہ ہے کہ ایک دن ایک مکھی کا گزر مکڑے کے گھر (جالے) کے پاس سے ہوتا ہے جو کئی دن سے بھوکا ہوتا ہے، مکھی کی خوشامد کرتا ہے، بے گانگی کا طعنہ دیتا ہے لیکن مکھی اس کی چال سمجھ جاتی ہے اور اس کی باتوں میں نہیں آتی۔ مکڑا بھی بھانپ لیتا ہے کہ مکھی آسانی سے اس کے ہاتھ نہیں آنے والی، لہٰذا وہ اس کی مزید خوشامد کرتا ہے اور حوصلہ نہیں ہارتا، بالآخر مکھی اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنی جان گنوا بیٹھتی ہے، آخری شعر ملاحظہ کیجیے:

بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا(۲۰)

مذکورہ تمثیل میں دو اخلاقی اسباق پوشیدہ ہیں؛ ایک یہ کہ اگر انسان کوشش کرے کرے تو ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے، دوسرے یہ کہ انسان کسی کی خوشامد میں آ کر نادانی کر بیٹھتا ہے اور نقصان اٹھا لیتا ہے۔

اسی مجموعے کی دوسری تمثیل ''شمع اور پروانہ'' ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر شمع سے پروانے کی دیوانگی اور فریفتگی کے وجوہات جاننے کے لیے کچھ سوالات کرتا ہے۔ وہ یہ کہ اے شمع! پروانہ تجھ سے پیار کیوں کرتا ہے؟ اسے آدابِ عشق کس نے سکھائے ہیں؟ کیا تیری برقِ نگاہ کا پھونکا ہوا ہے جو تیری جلوہ گاہ کا طواف کرتا رہتا ہے اور کیا آزارِ موت میں اسے راحتِ جان اور تیرے شعلے میں اسے زندگیٔ جاوداں نصیب ہوتی ہے؟ اور پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ غم خانۂ جہاں میں تیری ضیا کے باعث اس تفتہ دل کا نخلِ تمنّا ہرا ہوتا ہے، تیرے حضور گرنا اس کی نماز اور اس کے دل میں سوز و گداز ہے، اس میں جوشِ عاشقِ حُسنِ قدیم ہے۔ اس کے لیے تُو چھوٹا سا طُور اور یہ تیرا چھوٹا سا کلیم ہے ورنہ ایک پروانے کے لیے ذوقِ تماشائے روشنی اور کیڑے کے لیے روشنی کی تمنّا کس لیے؟ اس سے یہ اخلاقی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ایک انسان کو اپنے خالق سے ہی ویسی محبت رکھنی چاہیے جیسی چاہت ایک پروانہ شمع سے رکھتا ہے۔ نظم ''شمع و پروانہ'' کے آخری دو اشعار ملاحظہ ہوں:

کچھ اس میں جوشِ عاشقِ حُسنِ قدیم ہے
چھوٹا سا طُور تُو ، یہ ذرا سا کلیم ہے

پروانہ اور ذوقِ تماشائے روشنی
کیڑا ذرا اور تمنّائے روشنی(۲۱)

نظم ''جگنو'' ایک ایسی تمثیل ہے جس میں اقبالؒ نے پروانے (پتنگے) اور جگنو کا تقابل کر کے ''جگنو'' کو فضیلت دی ہے، کیوں کہ پروانہ روشنی کا طالب اور جگنو سرتاپا روشنی ہے اور روشنی بانٹتا ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں:

پروانہ اک پتنگا ، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب ، یہ روشنی سراپا(۲۲)

مذکورہ نظم سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ''مردِ مومن'' کو انسانیت کے لیے منارۂ نُور کا کام دینا چاہیے نہ کہ روشنی کے انتظار میں زندگی گنوا دے۔

نظم ''ایک پرندہ اور جگنو'' جیسی تمثیل میں ایک مرغِ نغمہ پیرا اور جگنو کی کہانی بیان ہوئی ہے کہ کس طرح مرغِ نغمہ پیرا جگنو کو چمکتا ہوا دیکھ کر اسے اڑا لینے کی غرض سے پاس جا پہنچتا ہے لیکن جگنو کی فریاد پر اپنا ارادہ ملتوی کر دیتا ہے۔ اقبال تحریر کرتے ہیں:

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی(۲۳)

اس تمثیل سے یہ اخلاقی سبق ملتا ہے کہ ''مردِ مومن'' کو یہ شایاں نہیں کہ وہ مظلوم اور مجبور و مقہور پر ظلم و ستم کرے بل کہ ان کی دادرسی کو پہنچے اور ہمدردی کرے۔

نظم ''خضرِ راہ'' کا ایک شعر دیکھیے جو ایک مختصر سی لیکن بھرپور تمثیل ہے اور اپنے اندر ایک جہانِ معنی لیے ہوئے ہے:

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو!(۲۴)

مذکورہ بالا شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ''مردِ مومن'' کو چاہیے کہ وہ اپنی فطرتِ سلیم کے مطابق کسی اور منبع سے کسبِ ضیا کے بجائے اپنے تجلّی زار میں آباد ہونا چاہیے اور خود کو کاملاً اپنے خالق کا تابعِ فرمان کر لینا چاہیے۔

نظم ''چیونٹی اور عقاب'' جیسی مختصر مکالماتی تمثیل میں اقبالؒ نے بیان کیا ہے کہ ایک چیونٹی عقاب سے سوال کرتی ہے؛ میں کیوں پامال، خوار، پریشان اور دردمند ہوں اور کیوں تیرا مقام ستاروں سے بھی آگے ہے؟ جواباً عقاب کہتا ہے؛ تُو اپنا رزق خاکِ راہ میں تلاش کرتی ہے جب کہ میں تو سپہر کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

چیونٹی اور عقاب

چیونٹی

میں پایمال و خوار و پریشان و دردمند
تیرا مقام کیوں ہے ستاروں سے بلند؟

عقاب

تُو رزق اپنا ڈھونڈتی ہے خاکِ راہ میں
میں تو سپہر کو نہیں لاتا نگاہ میں!(۲۵)

چیونٹی جیسی بے مایہ اور حقیر سی مخلوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

حَتّٰی اِذَآ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ لَا قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰٓاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ج لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ لا وَهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ☆

ترجمہ: جب وہ چیونٹیوں کے میدان میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ، ایسا نہ ہو کہ بے خبری میں سلیمانؑ اور اس کا لشکر تمھیں روند ڈالے۔(۲۶)

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ اگرچہ شیکسپیئر کے نظریۂ نقل کی متابعت میں ڈرامے کو نقل کی نقل جانتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کرداروں کی ذات کی نفی ہوتی ہے۔ اس کے مقابل وہ مردِ مومن کے لیے نظریۂ خودی و بے خودی کے حق میں ہیں، لیکن اپنے ''مردِ مومن'' کی تکمیل کے لیے انھوں نے معمولی سی مخلوقات یعنی حشرات الارض کی تماثیل تخلیق کرنے سے بھی گریز نہیں کیا، کیوں کہ انھیں مقصدیت سے غرض تھی اور وہ اپنی اس مقصدیت کے حصول میں کام یاب رہے۔

حوالہ جات

۱۔ منظر اعظمی، اردو میں تمثیل نگاری، نئی دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۹۲ء، ص:۵۳

۲۔ درسی اردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان پاکستان، ۲۰۱۲ء، ص:۳۹۳

۳۔ گیان چند، ڈاکٹر، تحریریں، س ن، ص:۲۷۰

۴۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد اوّل، ۱۹۶۴ء، ص:۶۴۱

5. Alexander Priniger, Encyclopaedia of Poetry and Poetics,

6. The Columbia Encyclopaedia, P-52

۷۔ یوسفؒ، صلاح الدین، حافظ، تفسیر احسن البیان (اردو)، مترجم: مولانا محمد جونا گڑھیؒ، کتاب وسنت کی اشاعت

کا عالمی ادارہ، س ن، ص:۵۲۱

۸۔ ایضاً، ص:۷۷۔۷۷۶

۹۔ ایضاً، ص:۷۸۶

۱۰۔ ایضاً، ص:۵۲۵

۱۱۔ محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (ضربِ کلیم)، لاہور: الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، س ن، ص:۱۵

۱۲۔ محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (بالِ جبریل)، لاہور: الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، س ن، ص:۵۱

۱۳۔ ایضاً، ص:۴۵

۱۴۔ محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (بانگِ درا)، لاہور: الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، س ن، ص:۱۵۸

۱۵۔ محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (ضربِ کلیم)، ص:۵۳۔۵۲

۱۶۔ عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبالؒ کا نظامِ فن، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، س ن، ص:۱۴

۱۷۔ محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (بالِ جبریل)، ص:۱۴۱

۱۸۔ ایضاً، ص:۱۳۳

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۰۱

۲۰۔ محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (بانگِ درا)، ص:۱۶

۲۱۔ ایضاً، ص:۲۴

۲۲۔ ایضاً، ص:۵۸

۲۳۔ ایضاً، ص:۶۴

۲۴۔ ایضاً، ص:۲۰۳

۲۵۔ محمد اقبالؒ، کلیاتِ اقبال (بالِ جبریل)، ص:۴۵۔۱۴۴

۲۶۔ یوسفؒ، صلاح الدین، حافظ، تفسیر احسن البیان (اردو)، مترجم: مولانا محمد جوناگڑھیؒ، کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ، ص:۴۹۵

☆.....☆.....☆